

شاہ جی اور مولانا محمد گل شیر شہید

اللہ کریم نے مجلس احرار اسلام کو ایسے عظیم المرتبت رہنماؤں اور قابلِ حدِ تمعین کارکنوں سے نوازا تھا کہ ان میں سے ہر ایک فرد اپنے مقام پر استقامت کا پہاڑ اور غیرتوں کا مرقع تھا۔ قیامِ ازل سے انہیں بے شمار خوبیوں و دیوت ہوئی تھیں۔ جن کی مثال دیگر جماعتوں کے رہنماؤں اور کارکنوں میں آج بھی مفقود ہے۔

حضرت امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ مجلس احرار کی آبرو تھے۔ یا عبد اللہ ملک کے الفاظ میں "شاہ جی اور احرار میں گل و بلبل کا رشتہ تھا۔ اور اس رشتے و تعلق کو صرف موت ہی جدا کر سکی۔ شاہ جی کی سر طراز شخصیت کا ظہور تھا کہ لوگ کھپے چلے آتے۔ اور بہروں جمالِ ہمنشین کا لطف اٹھاتے۔ شاہ جی اپنے سکندرانہ جلال اور قلندرانہ اداؤں کی بدولت لپٹوں کے دلوں کی گھمرائیوں میں یوں بس گئے کہ پھر کوئی دوسرا ان کی جگہ نہ لے سکا۔ شاہ جی حسبِ اور لبِ سادہ کی لمانتوں کے امین تھے۔ اور اپنی صفاتِ عظیمہ میں قرونِ اولیٰ کی یادگار تھے۔ ان کے مہابدانہ معرکوں کا اعتراف کس نے نہیں کیا۔ یہاں تک کہ جب ان کی وفات کی خبر ان کے مرشدِ قطبِ انقلاب حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری تک پہنچی تو وہ شدتِ غم سے دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ کیونکہ مرشد کے آنیئے دل سے بڑھ کر کس پر مریدِ باصفا کے باطن و ظاہر کے احوال منکسر ہو سکتے تھے۔

الفرض شاہ جی کو اگر مشاطہِ ازل نے اس طرح بنا سنوار کر یہاں بھیجا تھا کہ ماضیِ مرحوم میں ان کے حسنِ ظاہری اور باطنی میں ان کا کوئی ثبیل نہ تھا۔ تو قدرت کے دستِ فیاض نے انہیں ساتھی بھی ایسے عظیم عطاء کئے تھے جو اپنے مقام و مرتبے، علم و عمل اور مزاج و طبیعت کے اعتبار سے بھی سرِ پائے احرار تھے۔ انہیں تو یوں محسوس کرتا ہوں کہ وہ سب شاہ جی کی ذات ہی کے لئے پیدا کئے گئے تھے۔ چودھری افضل جی ایسے رہنما سے لے کر جانباز مرزا ایسے کارکن تک ہر رہنما و کارکن تمام تر احراری صفات کا مکمل آنیئے دار تھا جو سیرتِ رسول ﷺ ازواج و اصحاب رسول رضی اللہ عنہم کا عکسِ جمیہ تھیں۔ ہر ایک کا شاہ جی سے اور شاہ جی کا ہر ایک سے اپنا ہی تعلق خاص تھا جو بس اسی کے لئے مخصوص تھا۔

مولانا محمد گل شیر شہید بھی شاہ جی سے اپنے تعلقِ خاطر کے لحاظ سے منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ مجلس احرار میں شمولیت سے پیشتر مولانا گل شیر شہید کے تاریخی کام کا دائرہ کار گجرات، راولپنڈی، جہلم، انکب، چکوال، میانوالی، بکھر، خوشاب، شاہ پور، سرگودھا اور مظفر گڑھ وغیرہ کے اضلاع میں پھیلا ہوا تھا اور وہ ان علاقوں میں اپنے اثر و رسوخ کے حوالے سے جانباز مرزا کے بقول "مسلمانوں کے دلوں پر راج کرتے تھے۔" ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۸ء تک کا زمانہ مولانا گل شیر نے اصلاحِ رسوم و تبلیغِ اسلام، عورتوں میں بدو سے پر زور اور ان کے حقوق پر توجہ، ہندوؤں کے تہارت پر قبضہ کے خلاف تحریکات، مسلمان قبائل میں صلح و اتحاد، غریب مسلمان کاشتکاروں کی مالی امداد اور خاکسار تحریک کے عقائد و نظریات کی سرکوبی میں گزارا۔ اس وقت تک آپ سیاسیاتِ ہند میں وارد نہ ہوئے تھے۔ اور

انگریز پرستوں کے پھیلانے گئے پروپیگنڈے کے تحت آپ بھی مجلس احرار کو کانگریس کی زرخیز جماعت سمجھتے تھے۔ جب کبھی ان علاقوں میں شاہ جی یا مولانا حبیب الرحمن ندوی وغیرہ تشریف لاتے تو آپ دوسرے ہی روز اسی مقام پر جلسہ کرتے اور احرار رہنما کی تقاریر کے اثرات کو اپنی شعلہ بیانیوں سے ختم کر کے رکھ دیتے۔ شاہ جی بھی مولانا گل شیر کی اثر انگیز شخصیت کے معترف تھے اور ان کی عوام میں مقبولیت اور جادو بھری خطابت سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔ یہاں تک کہ شاہ جی نے میانوالی کے ایک اجتماع میں مولانا کی عوام میں اثر پذیری کا اعتراف کر ڈالا اور سامعین سے فرمایا کہ:

”بھائی! تمہارا کیا اعتبار ہے تم تو ریت کے ٹیلے ہو۔ جب انگریز کے خلاف تمہارا ذہن تیار

کر کے چلا جاتا ہوں تو ایک تند و تیز بگوند آتا ہے اور تمہیں اڑا کر لے جاتا ہے۔“

ابھی تک ان دونوں رہنماؤں کی آپس میں کہیں ملاقات نہ ہو پائی تھی کہ غلط فہمیوں کے بادل چھٹے۔ ۱۹۳۸ء میں ہی عالمی سطح پر جنگ عظیم دوم کے آثار واضح ہو رہے تھے بڑی سیاسی جماعتیں ان اہم نوعیت کے فوجی اصطلاح پر نظر جمائے بیٹھی تھیں۔ لیکن مولانا کے ہوتے ہوئے یہاں کسی سیاسی جماعت کا قیام عمل میں نہیں آسکتا تھا۔ اب صرف ان کی ذات ہی اسیدوں کا مرکز تھی۔ کیونکہ آپ کا وزن جس پڑے میں جاتا وہی جماعت یہاں قدم جمانے میں کامیابی حاصل کر سکتی تھی۔ مگر آپ نے تمام جماعتوں کی دعوتوں کو یکسر مسترد کر دیا۔

جج کے ایام نزدیک آپکے تھے اور آپ اپنی تیاریوں میں مصروف تھے کہ اسی اثناء میں لاہور میں شاہ جی سے آسمنا سامنا ہو گیا۔ شاہ جی بڑے تپاک سے ملے۔ دونوں طرف سے محبت بھرے جذبات کا سیلاب اسٹنڈ آیا۔ شاہ جی بالاخر دل کی بات زبان پر لائے اور آپ سے فرمایا کہ:

”گل شیر! میں تمہاری دینی خدمات سے کماحقہ واقف ہوں۔ تمہارا ہر دینی قدم مجھے بے حد عزیز

ہے۔ ہم سب کا مقصد خدمت اسلام ہے۔ اور نجب منزل ایک ہے تو یہ دوری اچھی نہیں لگتی۔

ہمارے ساتھ مل کر تم اپنی خدمات کو وسیع پیمانے پر انجام دے سکتے ہو۔ میں ایک خط کا اظہار اگلاس

موقع پر کر دوں تو شاید غیر مناسب نہیں کہ اب دین متین کی سب سے بڑی خدمت انگریز کو ہندوستان

سے نکالنے کے لئے جہاد کرنا ہے۔ کیونکہ اس نے ہند پر ہی تسلط نہیں جمایا بلکہ جزیرۃ العرب کو بھی اپنی

ہوس کا نشانہ بنایا ہے اور اپنے خود کاشہ پودے سے قادیانیت کے ذریعے دین مصطفیٰ ﷺ میں نقب

لگائی ہے۔ مسند ہو کر ہی لٹتے ہوئے غریب الوطن دین کا دفاع کیا جاسکتا ہے۔ اگر آپ ہمارا ساتھ دیں تو

دشمن منہ کی کھائے گا (ان شاء اللہ)

مولانا گل شیر نے شاہ جی کی گفتگو سن کر عرض کیا:

”حضرت! آپ کا فرمان بجا ہے۔ میں اکیلا نہیں ہوں۔ میں آیا تو باجماعت آؤں گا۔ میں نے دیگر

کئی دعوتوں پر غور کیا ہے۔ نہ معلوم کیا بات ہے کہ جب سوچتا ہوں تو ذہن ساتھ نہیں دیتا۔ یوں

موسس ہوتا ہے کہ کوئی کلمہ رہا ہے کہ:

”گل شیر! ابھی وہ گھڑی نہیں آئی“ میں کیا جانوں کہ وہ گھڑی کب آئے گی۔“

اس بات چیت کے بعد مولانا گھرواپس تشریف لے آئے۔ یہ ۱۹۳۸ء کے آخری دن تھے جنوری ۱۹۳۹ء کے اوائل میں آپ حج بیت اللہ کے لئے عازم سفر ہو گئے۔ آپ کے ہمراہ مولانا قطب الدین آف غور عسکری، مولانا عبدالغفور ہزاروی، مولانا غلام اللہ خان اور مولانا قاضی زاہد الحمیدی بھی زائرینِ حرمین تھے۔ مولانا نے روضۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر سایہ بارگاہِ ایزدی میں شہادت کی موت کے لئے دعاء کی اور اسی مقدس مقام پر رب العزت کے حضور گڑگڑا کر عرض کیا کہ:

”اے اللہ! میرا تعلق اس جماعت سے جوڑ دے جو خالص تیری رضا اور تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی سر بلندی کے لئے مصروفِ عمل ہو۔“

آپ گھر سے یہ ارادہ باندھ کر چلے تھے کہ: ”روضہ رسول ﷺ سے جواب لے کر ہی لوٹوں گا۔“ دعاء مستجاب ہوئی اور آپ وہیں زیارتِ حبیبِ کبریٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض یاب ہوئے جیسا کہ احرار میں شمولیت کے بعد ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ:

”مجھے احرار کے شیخ پر دلی مسرت ہوتی ہے کہ میں یہاں آیا نہیں لایا گیا ہوں۔ مجھے لانے والا کوئی جھوٹی حیثیت کا مالک نہیں بلکہ میں سرورِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا مامور ہوں اور فرض کی بجا آوری کو ہی اپنا فرض خیال کر کے کام میں مشغول ہوں۔ مجھے اس بات کا حکم میرے آکا صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس وقت دیا جب میں اُن کی ادب گاہ کے زائر کی حیثیت سے مدینۃ النبی ﷺ میں مقیم تھا۔ رات سویا تو خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی اور ارشاد فرمایا:

”گل شیر! اگر اسلام کی خدمت کا جذبہ رکھتے ہو تو جاؤ ہندوستان میں احرارِ اسلام کے ساتھ تعاون کرو۔“ (روزنامہ ”آزاد“ لاہور ”احرار نمبر“ ۲۷ ستمبر ۱۹۵۸ء ص ۳۶)

اس واقعہ کے ساتھ ہی آپ کی فکر و نظر کے زاویے تبدیل ہو گئے۔ مارچ ۱۹۳۹ء میں وطن واپس آئے چند دن گاؤں (ملووالی ضلع ایک) میں گزار کر دفتر احرار لاہور میں تشریف لے گئے۔ حضرت شاہ جی جی نے احباب کے ہمراہ دفتر میں موجود تھے۔ آپ کی دفتر میں غیر متوقع آمد پر حیرت و تہمت اور مسرت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ آپ کا استقبال کیا گیا۔ آپ اور دفتر احرار؟ یہ جوڑ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ مولانا نے مہر سکوت توڑتے ہوئے یہ منتر النبی میں پیش آنے والا واقعہ سنایا اور اپنی خدمات مجلس احرار کے لئے پیش کرنے کا اعلان کیا تو شاہ جی نے آپ کو سینے سے چٹا لیا اور شاہ جی پر گر یہ طاری ہو گیا۔ آپ کی احرار میں شمولیت پر بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ مولانا احرار رہنماؤں سے ملنے کے بعد اپنے علاقے میں مجالس احرار کے قیام کے لئے سرگرم عمل ہو گئے۔ یہ وہ دور تھا جب فرنگی کے اقتدار کا سورج نصف النہار پر تھا۔ اور ان مصوص اضلاع میں جہاں مولانا اثر و رسوخ رکھتے تھے انگریز اور اس کے حاشیہ برداروں کی عوام پر اتنی مضبوط گرفت تھی کہ کسی کو دم مارنے کی جرأت نہ تھی۔ مجلس احرار اسلام اسی حریت پرور جماعت کا نام ہی سرمایہ پرستوں کے لئے کھلا چیلنج تھا۔ ان جاں سوز حالات میں مجلس احرار کے پلیٹ فارم سے مولانا کا ابھرنا کسی بڑے خطرے سے خالی نہ تھا۔ لیکن آپ نے آکا نے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی بجا آوری میں اس راہِ عزیمت میں اپنی جان تک لڑادی۔

آپ کی دعوت و انتظام کے نتیجے میں ۳۱، ۲۱، ۱ جون ۱۹۳۹ء کو ڈسٹرکٹ احرار کانفرنس پنڈی گھیب ضلع ایک میں انعقاد پذیر ہوئی۔ مولانا مظہر علی اعظم اور شاہ جی نے مختلف نشستوں سے خطاب کیا۔ ایک نشست کی صدارت پیر لال بادشاہ آف بکھٹ نے کی اور یونینٹ وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک بھی پیش کی۔

اس کامیابی کے بعد احرار رہنماؤں کی یہاں آمد و رفت میں حاصل تمام رکاوٹوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ۲۱ تا ۲۹ جولائی ۱۹۳۹ء کو آپ کے پروگرام کے تحت مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی قاضی احسان احمد شجاع آبادی حضرت شاہ جی اور خواجہ عبدالرحیم عاجز امر کسری نے ضلع میانوالی میں پانچ بڑے اجتماعات سے خطاب فرمایا۔ اور تحریک فوجی بھرتی بائیکاٹ کے سلسلے میں عوامی اذہان کو بیدار کیا۔

۳۱، ۳۰ جولائی ۱۹۳۹ء کو ڈسٹرکٹ احرار کانفرنس ملہوالی ضلع ایک اپنے گاؤں میں منعقد کی۔ شاہ جی اور مولانا لدھیانوی نے فوجی بھرتی کے خلاف مہم کو تیز تر کرنے کے لئے اپنی تمام تر شعلہ گفتاری سے کام لیا۔

ان اجتماعات کے انعقاد پذیر ہونے کے ساتھ ہی مولانا گل شیر اس علاقے میں بالخصوص اور ہندوستان بھر میں بالعموم احرار کے مشن کو لے کر اٹھے اور غلامی کی تاریکی میں غرقاب قوم کو لیلانے آزادی سے روشناس کرانے میں دیوانہ وار مصروف ہو گئے۔

مذکورہ بالا اجتماعات کے بعد شاہ جی مولانا کو اپنے ساتھ لاہور لے گئے تھے اور ایک جلسہ عام میں مولانا کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ!

”آج میں اپنے نال اک ہور جنا لے کے آیاواں۔“

کہ ”میں آج اپنے ساتھ ایک اور مرد لے کر آیا ہوں“ لفظ ”جنا“ ان علاقوں میں بہادر شخص کے لئے بولا جاتا ہے۔

شاہ جی اور مولانا کا تعلق ایسا جڑا کہ موت کا عارضی وقفہ ہی انہیں کچھ وقت کے لئے جدا کر سکا۔

اللہ کریم نے شاہ جی اور مولانا میں بعض مشابہتیں بھی پیدا کر دی تھیں۔ شاہ جی کی کیفیت آہ اور وجد آہیں قرأت نے ایک عالم سے خراج وصول کیا تھا۔ یہی حال مولانا کی ملکوت کا بھی تھا۔ شاہ جی نے اس سوال پر کہ ”آپ کو کبھی کسی کی ملکوت نے متاثر کیا؟“ فرمایا کہ:

”مجھے اپنے ساتھیوں میں سے مولانا گل شیر خان شہید رحمۃ اللہ علیہ کی ملکوت کلام الہی نے بے حد متاثر کیا۔ مولانا کی ملکوت قرآن حکیم سُن کر لوگ بے مدھ ہو جاتے تھے۔ مجھے آج تک کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں مل سکا جس کی ملکوت اتنی موثر اور کیفیت آور ہو۔“

یہی صورتِ تقریر کی تھی۔ شاہ جی اور مولانا کی تقریر میں حیرت انگیز مشابہت نظر آتی تھی۔ جس پر مرکزہ مجلس احرار ہند کو یہ سرکلر جاری کرنا پڑا تھا کہ:

”تأملت جماعتیں متوجہ ہوں کہ ایک ہی جگہ میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا گل شیر خان کو مدعو نہ کیا جائے۔“

اسی وجہ سے دونوں حضرات کی تقاریر کی مثال ایک مقام پر کم ہی ملتی ہے۔ جس شہر میں مولانا گل شیر تاریخ دے دیتے اور منتظمین شاہ جی کو مدعو کرنا چاہتے تو شاہ جی سختی سے یہ کہہ کر انکار فرمادیتے کہ:

”مولانا گل شیر کے ہوتے ہوئے میری ضرورت نہیں ہے۔“
جو قلبی موافقت کا بھی بھرپور اظہار و اعتراف ہوتا تھا۔

۱۹۴۳ء میں آل انڈیا احرار کانفرنس گوجرانوالہ میں شاہ جی اور مولانا اتفاق سے اکٹھے ہو گئے شاہ جی کی صدارت تھی مولانا کی خطابت نے وہ سماں باندھا کہ شاہ جی وجد میں آگئے اور وارفتگی سے اٹھ کر آپ کا ہاتھ چوم لیا۔
۱۹۳۹ء میں شاہ جی پر مشہور زمانہ مقدمہ بغاوت ”لدا حارام کیس“ قائم کیا گیا لیکن آپ باعزت بری کر دیئے گئے۔ اسی دوران مولانا پر بھی ایسا ہی ایک مقدمہ سکندر وزارت نے بنانا چاہا۔ لیکن آپ کے بیانِ صادق نے اُن کی تمام آرزوں کو خاک بسر کر دیا۔

جن دنوں شاہ جی مذکورہ مقدمہ میں رہا ہوئے تھے اس دوران سر سکندر حیات کا بیٹا سردار شوکت حیات مضر میں جنرل رو میل کی فوج کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ سکندر حیات خان بیٹے کی رہائی کے لئے مصر گئے۔ اس واقعہ اور شاہ جی کے مقدمہ کو مولانا نے بڑے خوبصورت پیرائے میں چنیوٹ کے ایک جلسہ عام بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:
”دیکھ میرے مولادے رنگ تھو وزیر داپتر اسیر تھی گیتے جنوں توں پھانسی لگوانا چاہندا اسی او ضیاء اللہ شاہ داپتر عطاء اللہ شاہ رہا تھی گیا۔“

چینا انج چھوٹا یار
مولانا مولد گھم مریدا یار

(میرے اللہ کے رنگ تو دیکھ کہ تم وزیر اعظم (سکندر حیات) کا بیٹا گرفتار ہو گیا لیکن سید ضیاء اللہ شاہ بخاری کا بیٹا سید عطاء اللہ شاہ بخاری جنہیں تم پھانسی لگوانا چاہتے تھے رہا ہو گئے)
سکندر حیات چونکہ جرجل سے بیٹے کی رہائی کے لئے مصر گئے تھے۔ حج کے ایام قریب تھے۔ وہ حج پر نہ گئے۔ اس پر مولانا نے انور صابری مرحوم کی یہ رباعی پڑھی تو مجمع تڑپ اٹھا۔

حرم کو بندہ لات و منات کیا جانے
خدا کے گھر کو سکندر حیات کیا جانے
کسی غریب کی اختر شمار یوں کے مزے
نہ جس نے رو کے گزاری ہو رات کیا جانے

مولانا اور شاہ جی میں محبت و الفت کا بھی عجیب ہی سلسلہ تھا۔ ریل و جیل کی صعوبتوں سے کبھی فرصت ملتی تو شاہ جی دفتر احرار لاہور میں شعر و ادب، دین و سیاست کے ساتھ ساتھ بذلہ سنبی اور چشمک بازی کا وہ میدان گرم کرتے کہ اللہ ان اس مفضل میں اگر مولانا تشریف لے آتے تو سب حضرات خصوصاً شاہ جی دیکھتے ہی احتراماً خاموش ہو جاتے۔ لیکن کب تک! شاہ جی تو رو توں کو ہنسانے والے تھے۔ ہلا کیوں کر چپ بیٹھتے۔ کچھ دیر بعد اوہ کوئی دوست بات چھیڑتا اور شاہ جی کو پھر کٹنا ہوا الطیف برآمد ہوتا اور ٹوٹا ہوا سلسلہ دوبارہ جڑ جاتا۔ مولانا بھی شریک ہو جاتے اور مفضل لوٹ لوٹ ہو جاتی۔

مولانا کے دل میں شاہ جی کی عظمت کا نقش کچھ اس طرح بیٹھ گیا تھا کہ تا دمِ واپس کسی کے مقابلے نہ مٹ

کا۔ یہی حال شاہ جی کا تھا۔ وہ جب کبھی ماضی کی یادوں کو کریدتے مولانا کا تذکرہ لڑتا آتا۔ اور وہ تادیر مولانا کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو موضوع بنائے رکھتے۔ ان دونوں شخصیتوں میں انس و محبت کی جو فضا قائم تھی وہ ہر دو کے خلوص و بے غرضی کی بنیاد پر تھی۔ اس پر ایک ہی مقصد کی لگن اور ایک ہی منزل کی جستجو نے قربتوں کے مزید سامان میسر کر رکھے تھے۔ دو عزیز ترین ساتھی تو شاہ جی نے اپنے پالنہار سے مانگ کر لیے تھے۔ ایک بقول ابو یوسف قاسمی مرحوم کے چودھری افضل حق اور دوسرے بقول مولانا عنایت اللہ چشتی کے مولانا گل شیر خان دونوں احباب سے شاہ جی کا تعلق دیگر رہنماؤں سے الگ نوعیت کا تھا۔ اور ان دونوں کی اپنا تک رحلت و شہادت نے شاہ جی کی صحت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

برصغیر کے قومی و سیاسی حالات اتنے گھمبیر ہو گئے تھے کہ احرار رہنماؤں کو بھی اتنی ہی شدت سے آزادی کی جنگ کو تیز تر کرنے کے لئے راس کھاری سے پشاور تک ہر محاذ پر دادِ شجاعت دینا پڑ رہی تھی۔ اور انہیں مہینوں بچوں کا منہ دیکھنا بھی نصیب نہ ہوتا تھا۔

اور مولانا گل شیر خان اپنی جان کو لاحق تمام خطرات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اعلان و اظہار حق کے لئے طویل دوروں میں مصروف تھے۔ آپ نے ۲۶، ۲۷ اگست ۱۹۴۳ء کو دو روزہ حکومتِ اُردو کانفرنس تہ گنگ صلیج ایک میں شرکت فرمائی۔ جناب کپتان غلام محمد صاحب (آف کچلاہ صلیج میانوالی) کی روایت ہے کہ مولانا نے اس کانفرنس میں فرمایا کہ:

”مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ پھر میں کبھی تہ گنگ نہیں آسکوں گا۔ یہاں میری یہ آخری تقریر ہے۔ ہاں میرے بعد شاہ جی یہاں آئیں گے اور تمہیں قرآن سنائیں گے۔“

اور یہ حقیقت ہے کہ اس کے بعد آپ تہ گنگ شریف نہ لاسکے۔ شاہ جی کے بارے میں آپ کا مندرجہ بالا جملہ شاہ جی سے آپ کی سچی محبت کا ترجمان ہے۔

مولانا گل شیر احرار میں شامل ہونے ہی تحریکی کاموں میں ایسے مصروف ہونے کے خواہش کے لمحات بہت ہی کم نصیب ہوئے۔ اب مرکزی مجلسِ عاملہ کے اجلاسوں یا مرکزی اجتماعاتِ احرار کے موقع پر ہی شاہ جی سے ملاقات ہوتی۔

۱۹۳۹ء میں احرار نے فوجی بھرتی بائیکاٹ کی تحریک چلا رکھی تھی۔ مولانا نے اس تحریک کو اپنے اصلع میں اتنے زور و شور سے ہوا دی کہ فرنگی اور فرنگی نواز حلقے ہوکھلا گئے۔ مولانا نے فوجی بھرتی میں اتنی مضبوط رکاوٹیں کھڑی کیں کہ انگریز کو یہاں سے جنگِ عظیم اول (۱۹۱۴ء) کی نسبت جنگِ عظیم دوم (۱۹۳۹ء) میں بہت کم فوجی رنگروٹ ہاتھ آئے۔ جس پر جاگیردار عناصر کے مفادات کو بھی سخت دھچکا لگا اور انگریزی دربار میں اُن کے علائقہ و قار کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ علاوہ ازیں مولانا نے سینکڑوں مقامات پر مجالسِ احرار کا قیام عمل میں لایا۔ جس کے نتیجے میں عوام میں آزادی کا شعور جاگا اور وڈیروں کو مظلوم عوام پر سے اپنا دبدبہ و دہشت بکھرتا ہوا نظر آیا۔ اس پر ستراد مولانا کا کالا باغ سے غریب کمیونوں کے شہری و سماجی حلقوں کے تحفظ و بحالی کے لئے آواز اٹھاتا تھا جس پر کالا باغ کے رئیس کو اپنا حاکمانہ غرور خاک میں ملتا ہوا دکھائی دیا۔

مولانا گل شیر کے ان اقدامات نے وڈیوں کی خیندیں حرام کر دیں۔ نخت و نکیر اور ظلم و ہیست کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ بجائے اس کے کہ مولانا کے کئے گئے عوامی و سماجی کاموں کی قدر کی جانی۔ عقیدت و محبت بھری نگاہیں ان کے فرشی راہ کی جاتیں لیکن جبر و تشدد اور سفاکی و درندگی نے ہار کب مانی ہے کہ اس سے سُر پر غرور بہر حال ختم کرنا ہی پڑتا ہے۔ انگریز، ہندو اور فرنگی کے چھیٹے فرزند نواب اسیر محمد خان آف کالا بارغ کے شیطانی منصوبے کے تحت بالآخر ۲۴، ۲۳ مئی ۱۹۴۴ء کی درمیانی شب مولانا کو اپنے گھر میں سوتے میں گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔

اس دوران شاہ جی سرسہ صلع حصار (انڈیا) کے دور سے پر تھے۔ رات کے چلے سے پہلے آپ کو اس اہم قومی و دینی حادثہ اور عزیز ساتھی کی اچانک رحلت کی اطلاع ملی۔ اور آپ اس صدمے کے زیر اثر بغیر تقریر کئے امرتسر روانہ ہو گئے۔

مولانا کی شہادت کی خبر ملتے ہی مرکزی دفتر احرار لاہور میں پرچم احرار سرنگوں کر دیا گیا اور صدر مرکز یہ احرار نے پنجاب بھر میں ۱۰ جون تا ۱۰ جولائی مولانا کی یاد میں احرار اجتماعات منعقد کرنے کا حکم دے دیا۔

مولانا گل شیر شہید کی جدائی کا صدمہ شاہ جی کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ یہ شاہ جی کے لئے نہ صرف محبوب رفیق کی فرقت کا غم تھا بلکہ انگریزی استعمار کی کمین گاہوں یعنی ان فوجی اصطلاح میں جاگیر داری کے خلاف ایک توانا آواز کا خاموش کر دیا جانا شاہ جی کے لئے بار خاطر تھا۔ انگریز کے گماشتوں کی اس سفاکانہ واردات پر شاہ جی شعلہ جوالہ بنے ہوئے تھے۔ آپ نے ۲ جون ۱۹۴۴ء کو فیصل آباد میں "یوم گل شیر" سے خطاب کیا اور نواب آف کالا بارغ کو مولانا کے قتل کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ:

"اے اسیر محمد خان! تو نے ایک مسلمان، حافظ قرآن، اسلام کے مسلخ اور سیر بے رفیق مولانا گل شیر خان کو اپنے راستے کا کاٹنا سمجھ کر قتل تو کر دیا لیکن یاد رکھنا تیری قبر بھی تمہ کو پناہ نہ دے گی۔"

شاہ جی کی یہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی اور نواب کالا بارغ اپنے ہی بیٹے کے ہتھوں مارا گیا۔ لیکن بظاہر اس کے قاتلوں کی نشاندہی قانون کے ہاتھوں نہ ہو سکی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ آج نواب کی قبر کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔ کالا بارغ کے نواح میں یہ بات مشہور ہے کہ نواب کی لاش کو دریائے سندھ کی موجوں کے حوالے کر دیا گیا تھا۔

و اللہ عزیز ذو انتقام

"اور اللہ ہی زبردست انتقام لینے والا ہے۔"

شاہ جی "یوم گل شیر" کے سلسلہ میں مولانا کے صلع انجھ میں شریف لائے۔ اور ۹ جولائی ۱۹۴۴ء کو تحصیل تہ گنگ کے گاؤں "لاوہ" میں مسجد بابیاں والی میں خطاب فرمایا۔ شاہ جی کی یہ تقریر ان کے دلی جذبات، غیرت دینی اور حزن و ملال کا اظہار تھی۔ آپ نے شہادت گل شیر کا پس منظر اور پیش منظر بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"مولانا گل شیر خاندان اسلام کے وہ عظیم بیٹے تھے جنہیں احرار میں شہرت کا حکم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں فرمایا۔ اس سے بڑھ کر ان کے لئے کون سی سعادت و خوش بختی ہو

سکتی تھی۔ وہ آج جس مقام اعلیٰ پر فائز ہو چکے ہیں وہ ہماری مدد و توصیف کا محتاج ہی نہیں ہے۔
مولانا گل شیر کا یہی ایک قصور تھا کہ انہوں نے سامراجی غلامی کے گھتے ہوئے اس علاقے میں اللہ کی حاکمیت کا پرچم بلند کیا۔ اور فرنگی اور اس کے خواجہ تاشوں کی اندرون خانہ گھنواؤنی سازشوں کو بے نقاب کیا لیکن افسوس کہ ملک و ملت اور دین اسلام کے درد میں ڈوبی ہوئی صدائے گل شیر پر لبیک کہنے کی بجائے خود انہیں ہی راستے ہی ہٹا دیا گیا۔ کتنے بد بخت تھے وہ لوگ! جنہوں نے ان کے خون بے گناہی سے اپنے ہاتھ رنگے اور کیسا خوش قسمت ہے گل شیر! کہ جسے دین حق کی خاطر شہادت عظمیٰ نصیب ہوئی۔ ہائے گل شیر! مجھے اپنی آرزوؤں کی سراج مل گئی۔ لیکن شہادت کا جام اپنے تک ہی کیوں رکھا۔ میں نے سنا تھا کہ اعوان بہت سختی ہوتے ہیں لیکن تو تو بنیل نکلا۔ اگر اپنے لئے شہادت کی دعا مانگی تھی تو میرے لئے کیوں نہیں مانگی۔ ہاں! جس جانور میں کوئی نقص ہو وہ قربانی پر نہیں لگتا شاید۔۔۔۔۔ میں ہی اس قابل نہ تھا کہ میرے حصے میں بھی شہادت آئی۔ (یہ کہتے ہی شاہ جی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور سارا مجمع بھی انکسار ہو گیا۔ طبیعت سنبھلی تو فرمایا)

گل شیر کا قتل معمولی قتل نہیں ہے کہ نتیجہ نہیں نکلے گا۔ گل شیر خان کا خون رنگ لا کر رہے گا۔ پھر تمہاری نوابی اور سرداری بھی تمہارا تحفظ نہیں کر سکے گی۔

گل شیر نے انگریز کو غائب اور تم جاگیرداروں کو وطن کا غدار کہا اور تمہارے کہ تو توں کا پردہ چاک کیا۔ لو سنو! آج اسی مقام پر جہاں گل شیر نے تمہیں لٹکا رہا تھا اور تمہیں قوم و ملک کا بے وفا اور نمک حرام قرار دیا تھا بخاری بھی تمہیں اور تمہارے فرنگی آکا کو ڈنکے کی چوٹ غائب، شیراز، غدار، ٹوٹھی، دین محمد ﷺ، دشمن اور است ممد یہ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کا باغی کہتا ہے۔ تم نے جو تعزیر مجھ پر جاری کرتی ہے ابھی کر لو۔ سید حاضر ہے۔

اے فرنگی زادو! تمہاری حیثیت و اہمیت مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ فرنگی کی چو کھٹ پر جبہ سائی اور زلہ ربانی تمہارا کردار رہا ہے۔ تم وہی ہو جنہوں نے کعبۃ اللہ کی مقدس دیواروں اور سید عبدالقادر جیلانی کے مزار کو لپسی گولیوں سے چھلنی کیا ہے۔ انگریزی حکومت کو مضبوط کر کے قوم کی عزت و آبرو کو گروی رکھ دیا ہے۔ وقت کے کسی فرعون و ہامان کا رعب و رعوت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہم حرار ایک بات جانتے ہیں کہ حکم بھی اللہ کا ہے اور زمین بھی اللہ کی ہے۔ جب تک آزادی کامل کا سورج طلوع نہیں ہو جاتا احرار کا ہر گل شیر انگریز اور اس کے زرخیز غلاموں کی دسیہ کاریوں کی راہ میں رکاوٹ بنتا رہے گا۔ چاہے کچھ ہو جائے ہمارا کارواں اسی خلوص اور لگن سے چلتا رہے گا جس طرح مولانا گل شیر نے زندگی کی ہر گھڑی و ساعت کو دعوت حق کی خاطر صرف کیا۔

"آئیں جواں مرداں حق گوئی و بے باکی

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رو باہی"
۱۱ جولائی ۱۹۳۳ء کو ڈسٹرکٹ احرار کانفرنس مسجد عید گاہ تہ گنگ (ضلع انک) تب میں منعقد ہوئی جس کے مہمان خصوصی شاہ جی تھے۔ خطبہ استقبال مولانا محمد علی جالندھری نے پیش کیا جبکہ دیگر مقررین میں مولانا مظہر علی

اعظم، مولانا عبد الرحمن میانوی، مولانا عبد الرحیم جوہر جملی، حافظ عزیز الرحمن، جانیہ مرزا، مولانا محمد باز گل، غلام محمد ہاشمی، کپتان غلام محمد اور رفیق غلام ربانی شامل تھے۔

شاہ جی جب بھی ان اصطلاح میں آئے گل شیر شہید کو ہمیشہ یاد کیا۔ شاہ جی اور گل شیر خان میں جو بدنی رشتہ قائم ہوا تھا وہ اللہ کے فضل سے آج بھی قائم ہے۔ شاہ جی کی لمبی و روحانی اولاد اور ان کی محبوب جماعت مجلس احرار اسلام آج بھی اُس تعلق کو برقی پارودی و استقامت سے نبھا رہی ہے۔ اور مولانا شہید کے نام و کام کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ آغا شورش کاشمیری نے مولانا کی شہادت پر خوب لکھا تھا کہ:

”آپ کی شہادت سے اس ویرانہ آبادی میں استقامت کا چراغ روشن ہوتے ہی بجھ گیا اور اس قیمتی انسان کے اٹھ جانے سے ایک ایسی جگہ خالی رہی کہ نہ احرار میں اس قسم کا انسان دوبارہ آسکا نہ کیمپلور کی مٹی ہی سے کوئی ایسا شخص اٹھا۔“

اور یہ تمی بھی ایک ناقابل تردید حقیقت کہ مولانا کے بعد اگرچہ مجالس احرار نے ان علاقوں میں کام کی رفتار کو کم نہ ہونے دیا لیکن اس کے وہ اثرات ظاہر نہ ہوئے جن کی توقع صرف مولانا سے ہی کی جاسکتی تھی۔ ان کی شہادت کے بعد یہ علاقہ ایسی محو سوں کی گرداب میں آگیا کہ کوئی مضبوط قیادت اب تک سامنے نہیں آسکی۔

مجلس احرار اسلام کے سٹیج سے ہی مولانا شہید کا نام سننے میں آتا رہتا ہے۔ جبکہ دیگر وہ پیشہ ور مولوی اور نام نداد قومی و سیاسی قائدین جنہوں نے مولانا کے نام پر اپنے جہنم کا ایندھن سمیٹا اور اب تک انہی کے واسطے سے معادلات حاصل کر رہے ہیں۔ انہیں کبھی یہ توفیق بھی نہ ہوئی کہ وہ گزشتہ اڑھائیس برس میں بمحض ایک دن ہی مولانا شہید کی یاد میں کسی کارز میٹنگ کا اہتمام ہی کرتے لیکن خوش قسمت کہ یہ سعادت صرف مجلس احرار اسلام کے ہی حصے میں آئی کہ انہوں نے مولانا کے بعد ان کے مشن کو زندہ رکھا اور تمام تر ترقی دہانیوں کے باوجود صحیح سمت میں کاروائی آگے بڑھایا۔ جس کی نشاندہی مولانا کر گئے تھے۔ اور محمد لطف اسی کا اثر ہے کہ نصف صدی بیت جانے کے بعد بھی ان کی یاد زندہ و تابندہ ہے۔

لیکن میرے دل کی اتنا گھم آئیوں میں ایک آرزو ہے جو برسوں سے ڈیرے ڈالے ہوئے ہے کہ ایسے کاش! مولانا شہید کے اپنے خاندان میں سے کوئی ایسا رجل رشید اٹھ کھڑا ہو جو ان کی محبوب جماعت، جس کے لئے انہوں نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پاک پر اپنی جان کا نذرانہ تک پیش کر دیا تھا۔ کا سرخ پرچم تمام کر میدان عمل میں نکل پڑے۔ اور مولانا کی چھوٹی ہوئی دینی و خانہ دانی وراثت کا امین ہو۔ آمین۔ بجاہ النبی اکرم و آکر واصحابہ اجمعین۔

وگرنہ مولانا تو آج بھی غالب کی زبان میں کہہ رہے ہیں:

کون ہوتا ہے حریف سے مرد انگن حق
سے مکر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

اللہ کریم ہمیں شاہ جی اور مولانا گل شیر شہید کے مشن کے ساتھ تا دم آخریں وفا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارا شرو و نشر بھی انہی برگزیدہ ہستیوں کے ہمراہ کرے۔ آمین۔